لطیف ترین شے ہے۔ وہ از روئے طبیعیات مادے کی کثافت کے واسطے کے بغیر کوئی جلوہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح غذا کو لیجئے۔ غذا میں کچھ کثیف حصے ہوتے ہیں اور کچھ لطیف معدے کے عملِ انہضام میں یہ ہوتا ہے کہ مقابلتہً لطیف جوہر الگ ہو کر خون میں مل کر جزوِ بدن بن جاتے ہیں۔ اور کثیف اجزا آنتوں کے راستے سے ہوتے ہوئے خارج ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی انسان ان لطیف جوہروں کو کیمیائی عمل سے الگ کرنا چاہے، اول تو اس میں پوری کامیابی نہیں ہو سکتی۔ لیکن جہاں تک الگ ہو سکتے ہیں وہ براہِ راست جسم کی بقا کے لئے کام نہیں آسکتے۔ فطرت نے غذا کا یہی اصول رکھا ہے کہ اس کی لطافت کثافت کے بغیر بقائے حیات کی ضامن نہیں ہو سکتی۔

ماہرین طبیعیات اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کائنات مادی کی اساسی حقیقت ماس اور انرجی ہے۔ یا مادے کی کثیف صورت اور اس کی طاقت۔ ماس کثیف ہے اور انرجی لطیف۔ مادہ کثیف انرجی میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر خالی انرجی ہوتی تو کائنات کا وجود نہ ہوتا۔ وجود کے لئے ضروری ہے کہ انرجی کی لطافت کی آمیزش مادے کی اس کثیف صورت کے ساتھ ہو جسے ماس کہتے ہیں۔ تمام مجرد تصورات لطیف ہیں، لیکن خالی مجرد تصورات سے کوئی وجود نہیں بنتا۔ غالب نے اس شعر میں ایک ایسا کلیہ بیان کیا ہے جو موجودات کے ہر شعبے پر قابلِ اطلاق ہے۔

نہیں گر سرو برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت مبارک

دنیا میں جو چیز یا جو مظہر بھی ہے اس کی ایک صورت ہوتی ہے، اور

ایک اس کے معنی۔ حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ صورت سے معنی کی طرف یا ظاہر سے باطن کی طرف آیا جائے۔ لیکن صرف حکمت ہی انسانی فطرت کا تقاضا نہیں اور انسان کا زندگی کے مختلف شعبوں سے جو تعلق ہے وہ کئی طرح کا ہوتا ہے۔ مثلاً عشق کا جو رابطہ ہے اس میں عقل و ادراک کا براہِ راست کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ انسان عام طور پر جن چیزوں سے لطف اٹھاتا ہے ان کی وہ کوئی عقلی توجیہ نہیں کرتا۔ جذبات اور تاثرات تعقل سے الگ بھی اپنی مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ محبت کرنے والے اس جذبے کی منطقی تحلیل نہیں کیا کرتے بلکہ انسانی تاثرات کی یہ ایک عجیب خصوصیت ہے کہ اگر ان میں معنی ڈھونڈنے کی کوشش کی جائے تو یہ کوشش تاثر کی کیفیت کو یا بالکل فنا کر دیتی ہے یا اسے بدل دیتی ہے۔ ذوقِ جمال میں کوئی استدلال نہیں ہوتا۔ جو شخص موسیقی سے لطف اٹھا رہا ہے وہ اس میں کوئی معنی تلاش نہیں کر رہا۔ خالص موسیقی میں خواہ وہ ساز سے نکل رہی ہو یا انسانی آواز سے، کوئی الفاظ نہیں ہوتے۔ جہاں الفاظ نہیں وہاں معنی کہاں سے آئیں گے۔ کیونکہ نفسِ انسانی میں تاثرات تو بے الفاظ ہوتے ہیں لیکن معانی الفاظ کا جامہ پہننے کے بغیر فضائے نفس میں بھی جلوہ گر نہیں ہوتے۔ اور ادراکِ معنی کا سرو برگ یا ساز و سامان ہر شخص کے پاس نہیں ہوتا۔ اس کی کمی یا فقدان سے یہ تو ضرور ہے کہ انسانی فطرت کا ایک اہم پہلو بروئے کار نہیں آیا۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ انسان دوسری حیثیتوں سے بھی معرا ہو گیا ہے۔ بہت سے لوگ طب اور وظائفِ اعضا کے علم سے ناواقف ہونے پر بھی بعض طبیبوں سے مقابلے میں زیادہ تندرست ہوتے ہیں۔ اسی طرح صرف و نحو جاننے کے بغیر بھی بعض لوگ فصیح البیان ہوتے ہیں۔ اسی طرح عقلی طور پر شاعری کی ماہیت سے ناواقف ہونے پر بھی اچھے خاصے شاعر ہو سکتے

SALEEM LIBRARY
1/S Sh[illegible]
Line Suohan K[illegible] Lahore.

ہیں۔ غرض زندگی کے بہت سے افعال و اعمال ہیں جن کے لئے سر و برگِ ادراکِ معنی ایک لازمی شرط نہیں۔ محض نیرنگِ صورت کا تماشا فقط ذوقِ جمال ہی کی تسکین نہیں کرتا، بلکہ اور کئی طرح حیات افزا ہو سکتا ہے۔ بغیر ادراکِ معنی کے 'موسیقی' جو محض سُروں کا تناسب ہے غذائے روح بن جاتی ہے۔ صوت کے لحاظ سے یہ محض نیرنگِ صوت ہے۔ لیکن بڑی مبارک صورت ہے۔ صورت اگر معنی نے بنائی ہے تو محض بحیثیت صورت بھی وہ بے معنی نہیں ہو سکتی۔ خواہ معنی کا براہِ راست ادراک نہ کیا جائے۔ نظارہ حسنِ ظاہری جو تماشائے صورت ہے اس کی نسبت نظیری کا ایک شعر ہے ؎

روئے نکو معالجۂ عمر کوتہ است — ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ ایم

خوبصورت چہروں کا نظارہ کوتاہی عمر کا علاج ہے یعنی اس سے عمر دراز ہوتی ہے۔ کہتا ہے کہ یہ نسخہ میرا تجویز کردہ نہیں، میں نے اسے طبیب نفس و بدن مسیحؑ کی بیاض میں سے نقل کیا ہے۔

غرض تماشائے نیرنگِ صورت بھی ایسی سرسری اور سطحی چیز نہیں کہ معنویت کے مقابلے میں اسے بالکل بے قیمت سمجھ لیا جائے۔ مصوری جو تماشائے نیرنگِ صورت سے پیدا ہوتی ہے ایک اعلیٰ درجے کا فنِ لطیف ہے۔ دیگر فنونِ لطیفہ بھی جن کا وظیفہ حسن پسندی، حسن پروری اور حسن کاری ہے زیادہ تر نیرنگِ صورت ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ انسان کی تہذیب و تربیت میں حکمت و اخلاق کے علاوہ ان کا بھی بڑا حصّہ ہے۔ غالبؔ خود ایک فنِ لطیف کا ماہر ہے۔ اگرچہ اس کے ساتھ سر و برگِ ادراکِ معنی بھی رکھتا ہے۔ لیکن اس کی طبیعت میں شعریت مقدّم ہے اور حکمت موخر۔ وہ معنی اور صورت دونوں سے لطف حاصل کر سکتا ہے۔ وہ موازنہ اور مقابلہ کر سکتا ہے

وہ خوب جانتا ہے کہ ہر شخص ادراکِ معنی کے لئے موزوں نہیں ہوتا۔ اور نہ ہر شخص کے لئے ہر وقت اور ہر حیثیت میں ادراکِ معنی ہی ضروری چیز ہے۔ اسی لئے کہتا ہے کہ اگر ادراکِ معنی کی قوت کسی میں نہیں یا کسی وقت نہیں تو نہ سہی، زندگی اور اقدار بھی رکھتی ہے۔ تماشائے نیرنگِ صورت بھی ایک اعلیٰ درجے کا روح پرور شغل ہے۔ جسے یہ حاصل ہے وہ بھی قابل مبارک باد ہے۔

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

انسان نے جو زبان بنائی وہ مادی چیزوں اور ان کے باہمی روابط کو سمجھنے سمجھانے کے لئے بنائی، اس کے بعد جب اسے نفسی کیفیات، تاثری احوال اور مجرد تصورات کو بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو ان کے لئے زبان موجود نہ تھی جو زبان موجود تھی وہ مادی اشیاء اور ان کے خواص کو بیان کرنے کے لئے وضع ہوئی تھی۔ مجبوراً یہ کرنا پڑا کہ نفسی کیفیتوں کے لئے بھی مادی الفاظ استعمال کئے جائیں۔ روح کو الفاظ بدن اور مادے سے مستعار لینے پڑے۔ ناز و غمزہ حسن کے لطیف اندازوں کا نام ہے۔ ان کے بیان کے لئے دشنہ و خنجر کے الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ حالانکہ دشنہ و خنجر مادی ہتھیار ہیں جنھیں ناز و غمزہ سے کوئی دور کا تعلق بھی معلوم نہیں ہوتا۔ زبان کے اکثر الفاظ مکانی ہوتے ہیں لیکن نفسی کیفیات زمانی ہوتی ہیں۔ زمان ایک نفسی چیز ہے جس کا کوئی مادی وجود نہیں۔ لیکن انسان زمان کو بھی جب قیاس کرتا ہے یا بیان کرنا چاہتا ہے تو مکانی الفاظ استعمال کرتا ہے زمان کو ایک خط کی طرح سمجھتا ہے۔ ایک لکیر ہے جو پیچھے سے کھنچتی ہوئی چلی آ رہی ہے، اور آگے کی طرف کھنچتی چلی جا رہی ہے۔ وقت کے ناپ تول کے پیمانے

اس نے یا شمس و قمر کی حرکاتِ مکانی سے معین کر رکھے ہیں یا دیگر مادی اجسام کی حرکت مکانی سے۔ ناپنا چاہتا ہے زمان کو جو مکانی نہیں۔ لیکن تصورات اور الفاظ مادی اور مکانی استعمال کرتا ہے۔ انسان نے خارج کا مطالعہ باطن کے مطالعے سے بہت پہلے کیا اور ساری زبان اسی دور میں بنائی جب وہ خارجی زندگی سے موافقت پیدا کرنے میں کوشاں تھا۔ اسی لئے خارج کے احوال کے بیان کے لئے زبان کے پاس کافی سرمایہ موجود ہے۔ خالص عقلی تصوّرات اور خالص نفسیاتی کیفیات کے بیان نے اسے ایسا مجبور کر دیا کہ وہ ناچار پکار اُٹھا ؎

ہم اور بیانِ حال کسی دم بہم نہیں — ہم ہیں تو بے سخن ہیں، سخن ہے تو ہم نہیں
احساسِ زندگی ہے تو تابِ رقم نہیں — رفتارِ نبضِ بود سپردِ قلم نہیں
عنقا کے پر لگے ہیں ہمارے خیال کو — گذرے ہے مثلِ سایہ کہ نقشِ قدم نہیں

انسان حیوانِ ناطق ہے۔ اور زبان ہی اس کا طرۂ امتیاز ہے لیکن اس کی نفسی اور باطنی زندگی نے اتنی لطافتوں اور گہرائیوں میں غوطہ زنی شروع کر دی کہ زبان بیان کا ساتھ نہ دے سکی۔ مشرق و مغرب میں تصوف کا جتنا لٹریچر ہے وہ سب تشابیہ استعارات، اشارات اور تمثیلات سے لبریز ہے۔ اسلام نے شراب کو حرام قرار دیا لیکن صوفیہ اور شعرا نے اسی ممنوع چیز کو استعارۃً اس کثرت سے برتا کہ مسلمانوں کا بہترین ادب میکدے کی داستان بن گیا۔ اور خمریات ایک مستقل موضوع شاعری بن گئی۔ بعض شعرا غالب کی طرح معانی کی شرابِ طہور پیتے تھے، اور مجازی شرابِ انگور بھی۔ ان کے کلام میں ایک دلچسپ ابہام پیدا ہو گیا، چاہو تو یہ شراب سمجھ لو اور چاہو تو وہ شراب۔ حافظ شیرازی کو اکثر مسلمان ولی اللہ سمجھتے ہیں۔ اور اس کے کلام کو لسان الغیب۔ تصوّف کے

اصول و مسائل میں جا بجا حافظ کے کلام سے استناد کیا جاتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں یہ گمان بھی ہے کہ حافظ شرابِ انگور کا بھی ضرور دلدادہ ہوگا کیونکہ اس کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں کہ انھیں مجاز سے ہٹا کر حقیقت کی طرف لانا زبردستی کی کھینچا تانی معلوم ہوتی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ خواہ مشاہدۂ حق ہی کی گفتگو ہو بادہ و ساغر کی اصطلاحات کے استعمال کے بغیر چارہ نہیں۔ ادبیات میں عشق کا بھی یہی حال ہوا۔ عشق کی سینکڑوں قسمیں ہیں لیکن سب سے زیادہ مشہور قسم وہی جنون ہے جو عام طور پر شباب میں طاری ہوتا ہے۔ عشق نے جب جنسی جذبات سے اوپر پرواز کی اور لطیف تر محبوب اس کے سامنے آئے تو اظہارِ تاثرات کے لئے جنسی زبان ہی کو مجبوراً استعمال کرنا پڑا۔ فرائڈ مشہور ماہر نفسیات اس نتیجے پر پہنچا کہ روحانیات میں جو جنسی زبان استعمال کی جاتی ہے وہ زبان کی مجبوری کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ساری روحانیات حقیقت میں جنسی جذبات ہی کی لطیف ساختہ صورت ہے۔ روحانیت خواہ کسی لباس میں پیش کی جائے اس کی تہ میں جنسی جذبات ہی ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی مفکر جس کا مذہب فرائڈ کی طرح خالص مادیت اور حیوانیت نہیں، فرائڈ کی اس توجیہ کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ صحیح ہے کہ جنسی جذبہ ایک بڑا قوی جذبہ ہے۔ اور خاص حالات میں وہ ساری زندگی پر اپنا رنگ چڑھا دیتا ہے۔ اور ادب لطیف بہت کچھ اس کا مرہونِ منت ہے۔ لیکن یہ کہنا بہت زیادتی معلوم ہوتی ہے کہ انسان کے تمام نصب العین اور اس کی تمام آرزوئیں اسی ایک جذبے کے زیر نگین ہیں۔ اللہ والوں نے کثرت سے جنسی عشق کی زبان استعمال کی ہے، لیکن یہ استعمال اسی مجبوری کی وجہ سے ہے جو غالب نے بیان کی ہے۔ حق تو اس قدر ورا الورا ہے کہ زبان تو ایک طرف خیال و قیاس و گمان و وہم سے بھی بالاتر ہے۔ اگر اسے

SALEEM LIBRARY
1/3 Sher-owsia Gate,
Line Subhan Khan Lahore.

محسوس کرنے والا شراب یا عشق مجازی کی اصطلاحیں استعمال کرے تو اس پر یہ بدگمانی کرنا ظلم معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی جذبات ہی نے لطیف صورت اختیار کرلی ہے ؎

حق را ز دلِ خالی از اندیشہ طلب کن　　از شیشۂ بے مے مئے بے شیشہ طلب کن
صائب

ہر چہ اندیشی پذیرائے فناست　　آنچہ در اندیشہ ناید آں خداست

مذہب نے خدا کے صفات کو بھی انسانی صفات ہی پر قیاس کیا ہے۔ حالانکہ ہر بلند مذہب کو اس کا احساس ہے کہ خدا کی صفاتِ مطلقہ انسانی صفات کے ہم رنگ نہیں ہو سکتیں۔ لامحدود کو محدود پر قیاس کرنا درست نہیں۔ مگر یہ بھی کچھ انسانی نفس کی مجبوری ہے اور کچھ انسان کی زبان کی۔ اگر کوئی عالم ماورائے حیات ہے تو قرینِ قیاس یہی ہے کہ وہاں نہ ہمارے زمان و مکان کے سانچے ہوں گے نہ ہمارے یہ بدن اور نہ یہ حواس۔ لیکن مذہب کو آخرت اور جزا و سزا کے متعلق کچھ نہ کچھ کہنا پڑتا ہے۔ بیان کے لئے یہی حواس کی زبان ہے۔ حیاتِ طیبہ کے لازمی نتیجے کے طور پر جو سرور و سکون حاصل ہوگا اس کے لئے جنّت کا نقشہ کھینچنا پڑتا ہے یہ نقشہ حواس ہی کی زبان میں کھینچا جا سکتا ہے۔ جن نفوس میں لطیف تر سرور و شعور کا کوئی وجدان نہیں ہوتا وہ ان تمام مادی نقشوں کو استعارہ نہیں بلکہ جسمانی اور مادی حقیقت سمجھتے ہیں۔ صوفیہ اور حکماؑ کا طبقہ اس ظاہر پرستی اور حواس پرستی کا منکر ہوتا ہے۔ لیکن عوام کا عقیدہ جسمانی اور مادی ہی رہتا ہے۔ یہ زبان کی مجبوریاں ہی ہیں جنھوں نے مذہبی عقائد کے روحانی سطح تک اٹھنے میں رکاوٹ پیدا کی ہے *

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

شاعری کی نفسیات کا یہ ایک دلچسپ مسئلہ ہے کہ اچھی شاعری کس قسم کی نفسیاتی کیفیات سے پیدا ہوتی ہے۔ یہاں اس مصنوعی شاعری سے بحث نہیں اور نہ ان شاعروں سے بحث ہے جنھیں حضرت جگر مرادآبادی کاریگرانِ شعر کہتے ہیں جو شخص عاشق نہیں اور عاشقانہ غزلیں موزوں کرتا ہے وہ الفاظ اور اوزان کا ایک کاریگر ہے شاعر نہیں - یا جس نے کبھی شراب نہیں پی اور خمریات کا ایک دیوان مرتب کر دیا وہ بھی صنّاع ہے شاعر نہیں - حقیقی شاعری حقیقی تاثرات کا جچے تلے اوزان اور الفاظ میں اظہار ہے۔ جنھیں مبدءِ فیاض سے شاعری کا ملکہ ودیعت کیا گیا ہے۔ ان کی طبیعتیں حسّاس ہوتی ہیں، ان پر اثرات زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔ اکثر تاثرات ایسے ہیں جن کی شدت کا مدار زندگی کی رکاوٹوں پر ہوتا ہے۔ بعض حکماؑ کا خیال ہے کہ انسان کے اندر جو عام شعور ہے وہ بھی زندگی کی رکاوٹوں سے پیدا ہوا ہے۔ اگر خارجی ماحول سے انسان کی کامل موافقت ہوتی تو شعور کی بھی ضرورت پیش نہ آتی۔ شاعری کی بے شمار قسمیں ہیں، ان میں سے عشقیہ شاعری سب سے زیادہ عام اور مشہور ہے۔ اور اصناف کو چھوڑ کر اسی صنف پر غور کیجئے۔ اگر ایک شاعر کو کسی سے عشق ہو جائے اور حصولِ مقصود میں اسے کوئی مزاحمت پیش نہ آئے تو کیا اس میں عشق کی آگ بھڑک سکتی ہے۔ عشق کی ساری خونچکاں داستان مزاحمتوں اور ناکامیوں کی داستان ہوتی ہے۔ اگر اتفاق سے کہیں عشق کامیاب ہو گیا تو کامیابی کے ساتھ ہی اس میں آگ یا تو خوشگوار ہلکی ہلکی گرمی میں تبدیل ہو جائے گی یا ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ ہر قسم کی ترقی کا مدار بھی زندگی کی رکاوٹوں پر ہے۔ ان رکاوٹوں کے متعلق مختلف قسم کے انسانوں

کا ردِ عمل مختلف قسم کا ہوتا ہے۔ کوئی عملی جد و جہد سے ان پر غالب آنے کی کوشش کرتا ہے، کوئی ان کے متعلق غور و فکر کرتا ہے۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ان کے جذبات ان رکاوٹوں سے بہت زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ جذبات اگر بیان ہو جائیں تو ان میں ایک گونہ تسکین پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ جو کچھ اس کے سینے میں موجزن ہے یا بست سے دلوں میں جذبات کی لہریں پیدا کر رہا ہے۔ اسے دل نشین طریقے سے بیان کر دے۔ شاعر عملی جد و جہد سے خارجی رکاوٹوں کو رفع نہیں کرتا۔ وہ ان رکاوٹوں سے پیدا شدہ تاثرات کو دل کش سخن میں تبدیل کر دیتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ تجربہ ہے کہ بہترین موسیقی وہ ہوتی ہے جس میں ساز کے ساتھ سوز بھی ہو۔ موسیقی شعر کا بھی ایک جزو لاینفک ہے۔ اس لئے اعلیٰ درجے کی شاعری میں بھی سوز کا ہونا لازم ہے جیسا کہ اقبال نے کہا ہے "زندگی کی صداقتیں اگر ٹھنڈے طریقے سے بیان کی جائیں تو اسے حکمت کہتے ہیں، لیکن جب سوزِ دل ان میں شامل ہو جائے تو وہ شعر بن جاتی ہیں۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت است — شعر مے گردد چو سوز از دل گرفت"

اب ذرا سوچئے کہ زندگی میں سوز کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ سوز تمنا کی ناکامی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ محرومی اور ناکامی انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ لگی ہوئی ہے۔ اسی لئے عرفی کہتا ہے ؎

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ — گوہرِ ہر سود در جیبِ زیاں انداختہ

انسانی زندگی متاعِ درد ہی کی گرم بازاری ہے۔ اور انسان کو جو کچھ نفع حاصل ہوتا ہے وہ بھی کسی نہ کسی نقصان ہی کی جیب میں سے نکالا جاتا ہے۔ شاعری کا فنِ لطیف بھی محرومی ہی کی جیب میں سے نکلتا ہے۔ شاعر کو جس قدر زیادہ

رکاوٹ اور محرومی کا احساس ہوتا ہے اسی قدر اس کی طبیعت شعر موزوں کرنے میں زیادہ رواں ہوتی ہے۔

اس سے پہلے بھی غالب کے بعض اشعار کی شرح میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ غالب اکثر زندگی کو ایک دریائے رواں سے تشبیہ دیتا ہے۔ اور اسی تشبیہ سے زندگی کے متعلق لطیف نکات پیدا کرتا ہے۔ شعر کی آفرینش کے متعلق بھی اس نے اسی تشبیہ سے کام لیا ہے۔ جب ندی نالے کے بہاؤ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو تو ان کا پانی ایک خاص سطح سے اوپر نہیں چڑھتا۔ لیکن آگے کہیں بڑی رکاوٹ آ جائے اور وہ راہ نہ پا سکیں تو پانی چڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ غالب کہتا ہے کہ اسی طرح آفرینشِ سخن بھی رکاوٹوں کی وجہ سے بڑھ جاتی ہے۔ یہ تشبیہ بڑی بلیغ اور عینِ حقیقت ہے۔ اس سے شاعر کی نفسیات اور شعر کی ماہیت پر بھی بڑی روشنی پڑتی ہے ؎

دیگر ز سازِ بیخودیِ ما صدائے مجو — آوازے از گسستنِ تارِ خودیم ما

نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز

شاعر زندگی کی رکاوٹوں سے جب شکست کھاتا ہے تو شکست کی آواز شعر بن جاتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ شاعر اس شکست سے شکستہ دل ہو کر یاس کے بھنور میں غرق ہو جائے۔ وہ رکاوٹوں کے مقابلے کے لئے امید افزا اور ہمت آفریں تصورات اور تاثرات بھی پیدا کر سکتا ہے۔ تسکین کے سامان تیار کرنا یہ بھی اس کی فطرت اور اس کے فن کا ایک جزو ہے۔ لیکن اس قسم کی سخن آفرینی کے لئے بھی مقدم یہ ہے کہ زندگی نے اس کی تمناؤں کے راستے میں بڑی رکاوٹیں ڈالی ہوں۔ رکاوٹیں جس قدر زیادہ ہوں گی اسی قدر وہ ان پر غالب آنے کے لئے جذبات کو ابھارے گا۔ شاعری بھی زندگی کے اس عام اصول

کے ماتحت ہے کہ اگر رکاوٹیں نہ ہوں تو حیاتِ انسانی میں کوئی ترقی نہ ہو۔

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

اگر تجھے کسی وقت یہ یقین ہو جائے کہ اگر کوئی دعا مانگوں تو قبول ہو جائے گی تو بس یہی ایک دعا مانگ کہ الٰہی میرے دل کو بے مدعا کر دے۔ یہاں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی مدعا نہ ہو تو زندہ رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ حیات بے مقصود بے سود ہو جائے گی۔ اس شعر میں مدعا سے مراد شخصی اور ذاتی اغراض ہیں جنھیں اکثر لوگ زندگی کے اصولوں کو سمجھنے کے بغیر اور ان کی مطابقت میں خود حتی الوسع جدوجہد کرنے کے بغیر گدایانہ انداز میں خدا سے مانگتے ہیں۔ خدا نے فطرت کے کچھ معیّنہ قوانین بنا رکھے ہیں۔ اور حیات و کائنات کا مدار انھیں قوانین کی پابندی پر ہے۔ زید اور عمر کی انفرادی خواہشیں لاانتہا ہوتی ہیں۔ اور اکثر باہم متصادم و متضاد کسی انسان کو یقین سے یہ معلوم بھی نہیں ہو سکتا کہ کیا چیز اس کے لئے حقیقت میں مفید اور کیا بات مضر ہوگی۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے عسیٰ ان تکرھوا شیئاً فھو خیر لکم و عسیٰ ان تحبوا شیئاً فھو شر لکم۔ ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز سے نفرت کرو لیکن وہ تمھارے لئے مفید ہو، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز سے محبت کرو اور وہ تمھارے لئے اچھی نہ ہو۔ اسی لئے اسلام نے جو اصل دعا سکھائی ہے اور جسے پانچ وقت نمازوں میں کئی بار دہرایا جاتا ہے وہ صرف صراطِ مستقیم پر چلنے کی تمنا اور طلبِ توفیق ہے۔ اس دعا میں سوا راہِ راست کے کسی خاص چیز کی طلب نہیں ایسی ہی دعا حکمتِ الٰہیہ اور مشیتِ ایزدی کے موافق ہو سکتی ہے۔ اسی طرح

جب کوئی شخص یہ دعا مانگتا ہے کہ اے خدا مجھے دنیا اور آخرت میں بھلائی دے تو اس میں بھی کسی مخصوص چیز کا تقاضا نہیں - ایسی دعا اگر حضورِ قلب سے ہو تو ضرور پوری ہوگی کیونکہ یہ منشاءِ الٰہی اور آئینِ حیات کے موافق ہے۔ خاص خاص مقاصد کے لئے دعائیں تو بعض اوقات ایسی ہوتی ہیں کہ اگر وہ قبول کر لی جائیں تو دعا مانگنے والا اور شاید اس کے ساتھ بہت سے اور لوگ بھی ہلاک ہو جائیں۔ عارف رومی بھی یہی کہتا ہے ؎

بس دعائے کان فناہست و ہلاک   از کریمی نشنود یزدانِ پاک

یعنی بہت سی دعائیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی قبولیت سے تباہی آ جائے اسی لئے خدا اپنی کریمی کی وجہ سے ایسی دعائیں کو نہیں سنتا۔ کئی حکماء اور اولیاء اللہ ایسے گزرے ہیں جو مخصوص چیزوں کے لئے دعا کرنے کو جائز نہ سمجھتے تھے خدا کے سامنے اپنی آرزوئیں بھی پیش کرتے تھے۔ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

رازِ دل باتو بگویم کہ خداوندِ منی   یا نہ گویم کہ تو خود مطلعی بر اسرار

اے خدا چاہتا ہوں کہ رازِ دل تجھ سے کہوں کیونکہ تو میرا مالک ہے۔ یا نہ کہوں، کیونکہ تو خود میرے اسرار پر اطلاع رکھتا ہے۔ اقبال بھی کہتا ہے۔ تو دعا کر رہا ہے کہ تیری آرزو پوری ہو، مگر تیرے لئے میری دعا یہ ہے کہ تیری آرزو ہی بدل جائے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ تیری دعا سے نظامِ فطرت تیرے لئے بدلے۔ لیکن ہاں تیری دعا سے یہ ہو سکتا ہے کہ خود تو بدل جائے۔ اگر بے غرض زندگی صراطِ مستقیم اور حیاتِ طیبہ کے لئے دعا ہوگی تو ایسی حالت میں دل کی حالت کو دلِ بے مدعا کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ کوئی ادنیٰ عارضی اور ذاتی اغراض اس میں نہیں - جنّت کی لذّات کے حصول کے لئے عبادت کرنا یا دوزخ کے جسمانی عذاب سے خوف زدہ ہو کر گڑگڑا کر دعائیں مانگنا عبادت کو آلودۂ غرض کر دیتا ہے۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

غالبؔ اپنی عملی زندگی میں عام انسانوں کی طرح خواہشوں کا بندہ تھا۔ ادنیٰ اور اعلیٰ خواہشیں بھی عام طور پر انسانوں کے دلوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اس کے سینے میں بھی ابھرتی تھیں۔ اس کے اندر آرزوؤں کا تلاطم شاید دوسروں سے زیادہ ہی ہو ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

بہت سی خواہشوں کو وہ گنہگاری سمجھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کا مرتکب تھا یا ارتکاب کی تمنا رکھتا تھا۔ جا بجا اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی سے خوش نہیں اور اسے حیاتِ صالحہ نہیں سمجھتا۔ اس کی سیرت کے بعض پہلو قابلِ ستائش نہیں، لیکن بعض ایسے بھی ہیں کہ ان کی خامی اور کوتاہی خود اس پر بھی واضح ہے۔ لیکن تابِ سخن اکثر جرأت آموز ہوتی ہے۔ اور خدا کی جناب میں بھی گستاخی سے گریز نہیں کرتی۔ دل میں یہ ہوتا ہے کہ خدا بھی میرے اندازِ بیان کی داد دے گا۔ اور اس گستاخی کا مجھ سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ تعلّی کا مرض اکثر شعرا میں پایا جاتا ہے۔ عرفیؔ یا اقبالؔ کی طرح کے حکمت شعار شعرا بھی اس سے بری معلوم نہیں ہوتے۔ شکوہ اس زور سے کرتے ہیں کہ گویا عدالت میں کھڑے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنے کے علاوہ مدعی اور قاضی دونوں پر الٹے الزامات لگا رہے ہیں۔ دیکھئے اقبالؔ کیا کہتا ہے ؎

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؔ
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

اور میدانِ محشر میں ؎

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

کبھی خدا سے کہتا ہے ؎

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

غالبؔ نے ایک فارسی مثنوی تقریباً پوری اس موضوع پر لکھ ڈالی ہے کہ میں محشر میں عدالتِ خداوندی میں پیش ہوا اور اجازت طلب کی کہ میں اپنے متعلق صفائی پیش کروں، یہ اجازت اسے مرحمت ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے کمال جرأت سے جو گستاخی کی حد تک پہنچ گئی ہے اپنی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے کھلے بندوں اس خدا پر الزامات کی بوچھاڑ کی ہے جس نے اس طرح کی زندگی بخشی۔ ان الزامات میں بھی غالبؔ نے وہی بات دہرائی ہے جسے اس نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔ بہت اچھا اگر گناہوں کا حساب لینا ہے تو لے لے لیکن دوسری طرف میری حسرتوں کو بھی شمار کر لے۔ پھر موازنہ کر کے دیکھ لے کہ گناہوں کی تعداد زیادہ نکلتی ہے یا حسرتوں کی۔ اب سوال یہ ہے کہ حسرتیں کوئی نیکیاں تو نہیں۔ جنھیں دوسرے پلڑے میں رکھ کر گناہوں کے ساتھ تولا جائے۔ اور اگر یہ گناہوں سے زیادہ وزنی نکلیں تو از روئے حساب نجات ہو جائے۔ غالبؔ کا رندانہ تصور یہ ہے کہ گناہ تو اسے کہتا ہے جو میں نے تیرے خلاف کیا۔ اس کے مقابلے میں حسرت آفرینی وہ ہے جو تو نے کی ہے۔ خواہشیں پیدا کر دیں اور ان کے پورا ہونے کے سامان مہیا نہ کئے۔ فارسی مثنویوں میں اس نے ذرا کھل کر تشریح کی ہے۔ کہتا ہے۔ بڑے سے بڑا گناہ میرا آخر یہی ہے کہ میں شراب پیتا تھا لیکن میری زندگی میں اندوہ تو نے پیدا کیا۔ اور ساتھ ہی شراب کو اندوہ ربا بنایا، تو بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے ؎

مگر ے کہ آتش بگورم از وست
بہنگامہ پروانہ خوردم از وست

میری قبر میں آگ اسی شراب نے ڈالی ہے جس کی وجہ سے زندگی

میں تھوڑی سی چیونٹی کی سی اڑان مجھ میں آجاتی تھی ؎

دل اندوہگین وسے اندہ رُبا　　　چہ کی کردم لے بندہ پرور خدا

دل میرا غم زدہ اور شراب غم غلط کرنے کا نسخہ۔ اے بندہ پرور میں اگر ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا۔ دیکھئے کہ بندہ پرور کا خطاب یہاں کس موزونیت سے لایا ہے۔ غم کے علاج کے لئے شراب کا پیدا کرنا بندہ پروری ہی تو ہے۔

کسی اور شرابی کا شعر ہے ؎

غم کی دوا مرض کی شفاء یعنی یہ شراب　　　کیا جانے بے نیاز نے کیونکر حرام کی

لیکن کہتا ہے کہ شراب نوشی کی گنہگاری بھی تو میں دل کھول کر نہ کر سکا۔ کبھی ملی کبھی نہ ملی، اور قرض کی پیتے رہے تو قرضخواہوں کے تقاضائے زشت نے ناک میں دم کر دیا اور سب مزا کرکرا ہو گیا ؎

بہ تمنائے گوشت مُردن بہ　　　ز تقاضائے زشت قصاباں

شراب خوری کا حساب لینا ہے تو جمشید جیسے لوگوں سے لے۔ اس مفلس شرابی سے کیا حساب لینا ہے۔ جس کی گناہگاری میں بھی حسرت کی آمیزش رہتی تھی ؎

اگر یافتم بادہ ساغر شکست　　　وگر یافتم رشتہ گوہر شکست

شراب میسر آئی تو پیالہ ٹوٹ گیا۔ موتی پرونے کے لئے دھاگا ملنے لگے تو موتی ٹوٹ گیا۔

ناکردہ گناہوں کی حسرتوں کا الزام خدا پر دھرتا ہے۔ اسے چاہیئے تھا کہ یا آرزوئیں پیدا نہ کرتا یا انھیں پیدا کر کے ممنوع قرار نہ دیتا۔ یا ان کے پورا ہونے کے سامان مہیّا کرتا ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد　　　یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

اسے یقین ہے کہ اگر حسرتیں بھی شمار ہو جائیں اور گویا یہ ہمارا فرض خدا کے

ذمے ہو تو گناہوں کا پلڑا اس کے مقابلے میں ہلکا ہی رہے گا۔ اس قسم کا حساب کتاب ہو تو از روئے انصاف ضرور نجات ملنی چاہیئے۔

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

زندگی علائق کا نام ہے اور ان علائق کی کوئی انتہا نہیں۔ طبیعت کو بیک وقت کئی کئی چیزوں سے علاقہ ہوتا ہے۔ ہر علاقہ نفس کو پا بہ زنجیر کرتا ہے۔ مطلقاً آزاد تو وہ ہوگا جو کسی تعلق سے بھی پابستہ نہ ہو۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے ؎

کہ کرد قطع تعلق کدام شد آزاد　　　بریدۂ زہمہ با خدا گرفتا راست

اسی مضمون کو اقبال نے ایک اور رنگ میں ادا کیا ہے ؎

وہ چیز نام ہے دنیا میں جس کا آزادی　　　سنی ضرور ہے دیکھی کہیں نہیں میں نے

اگر حقیقت یہ ہے تو آزاد انسان سے کیا مراد ہو سکتی ہے۔ اور قابل حصول آزادی کا نصب العین کیا ہو سکتا ہے۔ مذہب کی بلند ترین شکل میں اس مشکل کا یہ حل پیش کیا گیا ہے کہ انسان کا ضروری فرائض اور دنیا کی نعمتوں سے رابطہ تو ضرور ہو۔ کیونکہ اس کے بغیر زندگی خالی اور بے معنی ہو جائے گی۔ لیکن کوئی تعلق اس قسم کا نہ ہو کہ وہ روح کو جکڑ لے اور اس طرح اس میں سرایت کر جائے کہ روح کی کوئی مستقل اور آزاد حیثیت باقی نہ رہے۔ سب سے زیادہ رنج و الم اسی شخص کو ہوگا جس نے اپنی آرزوئیں اور حاجتیں بہت بڑھا لی ہوں۔ اور ہر حاجت روح کو اپنی شدید گرفت میں لے آئے۔ جو حاجت پوری نہ ہوگی وہ غم پیدا کرے گی۔ اور جب تک پوری نہ ہوگی دل اندوہگیں رہے گا۔ آزادگی کا مطمح نظر یہ ہے کہ روح کسی شے سے اس طرح ہم وجود اور ہم رنگ نہ ہو جائے کہ اس کے عدم حصول یا فقدان سے

SALEEM LIBRARY
1/S Sheranwala Gate,
Line Subhan Khan, Lahore.

اسے تعلق ہو۔ اپنے فرائض ادا کرے لیکن ان کے ثمرات و نتائج میں دل نہ اٹکائے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ دنیا میں اس طرح رہنا چاہیئے جس طرح بطخ پانی میں رہتی ہے۔ اس کے پَر خدا نے ایسے چکنے بنائے ہیں کہ پانی ان پر ٹھہر نہیں سکتا۔ وہ پانی میں رہتے ہوئے بھی گویا پانی سے الگ رہتی ہے۔ کسی چیز کے نہ ملنے یا فوت ہو جانے کا غم اگر دل کو اس طرح لگ جائے کہ گھن کی طرح اسے اندر اندر سے کھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دل نے اپنی تمام تر زندگی اس ایک چیز سے وابستہ کر رکھی تھی۔ دل جو خدا کا گھر ہے اور لامتناہی امکانات کی صلاحیت رکھتا ہے اس کو اتنا تنگ اور کم ظرف بنا لینا کہ کسی ایک چیز کے عدمِ حصول سے فنا ہونے لگے، زندگی سے نہایت درجے کی ناانصافی ہے۔ قرآن اللہ والوں کی کامیاب زندگی کا جب بھی نقشہ کھینچتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ وہ غم اور خوف سے آزاد ہو جاتے ہیں الا انّ اولیاء اللہ لا خوفٌ علیہم ولا ھم یحزنون۔ یہ ایک نصب العینی مقام ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہو سکتا ہے۔ اس سے ذرا اتر کر ان آزادوں کا مقام ہے جن کا ذکر غالب نے اس شعر میں کیا ہے کہ بتقاضائے بشریت انھیں غم ہوتا تو ہے لیکن ایک لمحے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ کسی بڑے نقصان سے یا کسی عزیز و محبوب کی موت سے انھیں صدمہ تو ہوگا لیکن یہ صدمہ جلد گزر جائے گا اور یاس کو روح پر قابض نہ ہونے دے گا۔ رحمتِ الٰہی زندگی کی عارضی زحمت پر بہت جلد غالب آجائے گی۔ دنیا کی چیزوں کے لئے غم کو دل پر محیط کر لینا اپنی روح کی بے قدری کرنا ہے۔ اگر کسی چیز کی تباہی سے دل تباہ ہونے لگے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ دل دل نہ تھا بلکہ وہ چیز بن گیا تھا۔ غالب کہتا ہے کہ غم کو چشمکِ برق کی طرح آناً فاناً گزر جانا چاہیئے آزادوں کی روش یہی ہے ان کے ماتم خانے کی شمع مسلسل نہیں جلتی کہ غم کا نقشہ ہمیشہ نظر کے سامنے رہے

اگر روح کا تعلق کسی چیز سے شدید ہوگا تو اس کے فقدان کے غم میں یہ شمع مسلسل جلتی رہے گی۔ آزادوں کا تعلق کسی چیز سے بھی اس انداز کا نہیں ہوتا۔

دنیا میں انسان کو سب سے زیادہ مال سے وابستگی ہوتی ہے۔ اس کی آرزو میں وہ جدوجہد کرتا ہے، اسی کے نقصان سے اس میں غم پیدا ہوتا ہے، اور اسی کے نقصان کا احتمال اس پر خوف طاری رکھتا ہے۔ اگر مال کی محبت انسان میں اس قدر شدید نہ ہو تو اس کی زندگی کا بیشتر حصہ غم و خوف سے آزاد ہو جائے اگر پورا ولی نہیں تو نیم ولی ضرور بن جائے۔ مال کی انسان کو ضرورت ہے لیکن وہ ہمیشہ ضرورت سے زیادہ کا طالب ہوتا ہے۔ اور یہی شوقِ تکاثر اسے ہلاک کرتا رہتا ہے۔ عارف رومیؒ نے بتایا ہے کہ مال کا تعلق انسانی زندگی سے کیسا ہونا چاہیئے

مال را کز بہرِ دیں باشی حمول — نعم مالٌ صالحٌ گفتا رسولؐ
آب در کشتی ہلاکِ کشتی است — زیرِ کشتی بہرِ کشتی پشتی است

اگر نیکی کے اغراض کے لئے مال چاہیئے تو ایسا مال مالِ صالح ہے جسے رسولؐ بھی نعمت قرار دیتے ہیں۔ زندگی کے لئے مال کی اس طرح ضرورت ہے جس طرح کشتی کے چلنے کے لئے اس کے نیچے ضروری مقدار پانی کی ہونی چاہیئے۔ پانی جب تک کشتی کے نیچے ہے۔ اس کے لئے روانی کا سبب اور سہارا ہے۔ لیکن یہی پانی اگر کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو اسے ڈبو دے گا۔ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ ہر مقصد کے حصول کے لئے اسباب کا مہیا کرنا فرض ہے۔ لیکن اسباب سے ایسی دل بستگی نہ ہونی چاہیئے کہ وہ روح کے اندر داخل ہو جائیں اور حاصل نہ ہونے پر اس میں اندوہ پیدا کریں۔ تعلقاتِ دنیا میں رہتے ہوئے بھی بے تعلقی، اسی کا نام روحانیت ہے جو حقیقی آزادی کا نصب العین

SALEEM LIBRARY
I/S Sheranwala Gate,
Line Subhan Khan, Lahore.

اسے تعلق ہو۔ اپنے فرائض ادا کرے لیکن ان کے ثمرات و نتائج میں دل نہ اٹکائے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ دنیا میں اس طرح رہنا چاہئے جس طرح بطخ پانی میں رہتی ہے۔ اس کے پَر خدا نے ایسے چکنے بنائے ہیں کہ پانی ان پر ٹھہر نہیں سکتا۔ وہ پانی میں رہتے ہوئے بھی گویا پانی سے الگ رہتی ہے۔ کسی چیز کے نہ ملنے یا فوت ہو جانے کا غم اگر دل کو اس طرح لگ جائے کہ گھن کی طرح اسے اندر اندر سے کھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دل نے اپنی تمام تر زندگی اس ایک چیز سے وابستہ کر رکھی تھی۔ دل جو خدا کا گھر ہے اور لامتناہی امکانات کی صلاحیت رکھتا ہے اس کو اتنا تنگ اور کم ظرف بنا لینا کہ کسی ایک چیز کے عدمِ حصول سے فنا ہونے لگے، زندگی سے نہایت درجے کی ناانصافی ہے۔ قرآن اللہ والوں کی کامیاب زندگی کا جب بھی نقشہ کھینچتا ہے تو یہی کہتا ہے کہ وہ غم اور خوف سے آزاد ہو جاتے ہیں الا اِنّ اولیاء اللہ لاخوفٌ علیھم ولاھم یحزنون۔ یہ ایک نصب العینی مقام ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہو سکتا ہے۔ اس سے ذرا اتر کر ان آزادوں کا مقام ہے جن کا ذکر غالب نے اس شعر میں کیا ہے کہ بتقاضائے بشریت انھیں غم ہوتا تو ہے لیکن ایک لمحے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ کسی بڑے نقصان سے یا کسی عزیز و محبوب کی موت سے انھیں صدمہ تو ہوگا لیکن یہ صدمہ جلد گزر جائے گا اور یاس کو روح پر قابض نہ ہونے دے گا۔ رحمتِ الٰہی زندگی کی عارضی زحمت پر بہت جلد غالب آ جائے گی۔ دنیا کی چیزوں کے لئے غم کو دل پر محیط کر لینا اپنی روح کی بے قدری کرنا ہے۔ اگر کسی چیز کی تباہی سے دل تباہ ہونے لگے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ دل دل نہ تھا بلکہ وہ چیز بن گیا تھا۔ غالب کہتا ہے کہ غم کو چشمکِ برق کی طرح آناً فاناً گزر جانا چاہئے آزادوں کی روش یہی ہے ان کے ماتم خانے کی شمع مسلسل نہیں جلتی کہ غم کا نقشہ ہمیشہ نظر کے سامنے رہے

اگر روح کا تعلق کسی چیز سے شدید ہوگا تو اس کے فقدان کے غم میں یہ شمع مسلسل جلتی رہے گی۔ آزادوں کا تعلق کسی چیز سے بھی اس انداز کا نہیں ہوتا۔

دنیا میں انسان کو سب سے زیادہ مال سے وابستگی ہوتی ہے۔ اس کی آرزو میں وہ جد و جہد کرتا ہے، اسی کے نقصان سے اس میں غم پیدا ہوتا ہے، اور اسی کے نقصان کا احتمال اس پر خوف طاری رکھتا ہے۔ اگر مال کی محبت انسان میں اس قدر شدید نہ ہو تو اس کی زندگی کا بیشتر حصہ غم و خوف سے آزاد ہو جائے اگر پورا ولی نہیں تو نیم ولی ضرور بن جائے۔ مال کی انسان کو ضرورت ہے لیکن وہ ہمیشہ ضرورت سے زیادہ کا طالب ہوتا ہے۔ اور یہی شوقِ تکاثر اسے ہلاک کرتا رہتا ہے۔ عارف رومیؒ نے بتایا ہے کہ مال کا تعلق انسانی زندگی سے کیسا ہونا چاہئے ؎

مال را گر بہرِ دیں باشی حمول   نِعمَ مالٌ صالحٌ گفتا رسولؐ
آب در کشتی ہلاکِ کشتی است   زیرِ کشتی بہرِ کشتی پشتی است

اگر نیکی کے اغراض کے لئے مال چاہئے تو ایسا مال مالِ صالح ہے جسے رسولؐ بھی نعمت قرار دیتے ہیں۔ زندگی کے لئے مال کی اس طرح ضرورت ہے جس طرح کشتی کے چلنے کے لئے اس کے نیچے ضروری مقدار پانی کی ہونی چاہئے۔ پانی جب تک کشتی کے نیچے ہے۔ اس کے لئے روانی کا سبب اور سہارا ہے۔ لیکن یہی پانی اگر کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو اسے ڈبو دے گا۔ دنیا عالمِ اسباب ہے۔ ہر مقصد کے حصول کے لئے اسباب کا مہیا کرنا فرض ہے۔ لیکن اسباب سے ایسی دل بستگی نہ ہونی چاہئے کہ وہ روح کے اندر داخل ہو جائیں اور حاصل نہ ہونے پر اس میں اندوہ پیدا کریں۔ تعلقاتِ دنیا میں رہتے ہوئے بھی بے تعلقی، اسی کا نام روحانیت ہے جو حقیقی آزادی کا نصب العین

بھی ہے۔ ہوا و ہوس کے بندے کہاں سے آزاد ہو سکتے ہیں۔

شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کے سوانح میں لکھا ہے کہ ملک التجار ہونے کی حیثیت سے ان کے مال تجارت کے جہاز چلتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے ایک گماشتے نے خبر دی، اطلاع ملی ہے کہ آپ کا فلاں فلاں جہاز سمندر میں غرق ہو گیا ہے۔ سن کر فرمایا الحمد للہ۔ کچھ روز بعد پھر وہی گماشتہ یہ خوشخبری لے کر آیا کہ وہ پہلی اطلاع غلط نکلی، جہاز صحیح سلامت ہے۔ پھر سن کر فرمایا الحمد للہ۔ گماشتے نے دست بستہ عرض کی کہ یہ شکرانے کا الحمد للہ تو سمجھ میں آیا ہے۔ لیکن پہلی مرتبہ حضور نے نقصان پر الحمد للہ فرمایا تھا وہ سمجھ میں نہ آیا۔ اس پر آپ نے فرمایا حقیقت میں تمھاری سمجھ میں نہ وہ آیا اور نہ یہ آیا۔ تم سمجھتے ہو کہ میں مال کے نفع و نقصان کے خیال میں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تم نے نقصان کی خبر دی تو میں نے اپنے قلب کی طرف دیکھا کہ اسے چوٹ لگی یا نہیں، دیکھا کہ کوئی چوٹ نہیں لگی۔ قلب کے اس حالت پر پہنچنے کا میں نے شکر ادا کیا۔ پھر تم نے مال کی سلامتی کی اطلاع دی تو میں نے اپنے قلب پر نظر کی کہ یہ مال سے خوش ہوا یا نہیں۔ دیکھا تو وہ اپنی اعلیٰ حالت پر تھا۔ اس پر پھر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس میں مال کی محبت نہیں۔ شاہ صاحب کا روحانی مقام بہت ارفع ہے۔ پاکیزہ نفس لوگ بھی وہاں تک کم پہنچتے ہیں۔ غالب نے ان آزادوں کا ذکر کیا ہے جن کے نفس پر غم کا ایک حملہ ضرور ہوتا ہے۔ لیکن وہ جلدی سے اس پر غالب آجاتے ہیں۔ یہ انداز بھی بہت قابل تعریف ہے اور بہت کم ایسے لوگ ہیں جنہیں یہ میسر آتا ہے۔

حافظ شیرازی فرماتے ہیں ؎

دمے باغم بسر بردن جہان یکسر نمے ارزد

بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمے ارزد

سارے جہان کی مجموعی قیمت بھی اتنی نہیں۔ کہ اس کی خاطر ایک دم بھی غم میں بسر کیا جائے۔ انسانی روح کی قیمت سارے جہان سے زیادہ ہے۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

عام خیال یہ ہے کہ شراب سے غم غلط ہوتا ہے۔ موسیقی کی نسبت بھی یہی عام گمان ہے کہ گانا باعث تفریح ہوتا ہے۔ غالب کہتا ہے کہ یہ خیال پیچھے سے چلا آتا ہے۔ اور بہت سے سادہ دل بزرگ جنھیں مے و نغمہ کی حقیقت کا علم نہیں یونہی سمجھتے ہیں۔ ان سے اس بارے میں بحث کرنا بے کار ہے۔ انھیں ان کیفیتوں کا کچھ تجربہ نہیں جو خاص قسم کے دلوں میں مے و نغمہ سے پیدا ہوتی ہیں نشۂ شراب کے اثرات کا استقرا کرنے والوں کی تحقیق یہ ہے کہ شراب کا اثر مختلف طبائع پر مختلف ہوتا ہے۔ ایک اثر تو عام ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نفس پر سے معاشرتی احتساب اور اخلاق و آداب کی پیدا کردہ رکاوٹیں ہٹ جاتی ہیں اور انسان کے تحت الشعور میں جو آرزوئیں یا تصورات دبے ہوئے تھے وہ بے روک ٹوک ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ لاطینی زبان میں ایک محاورہ ہے کہ شراب حق گو ہوتی ہے۔ یعنی شراب کے نشے میں آدمی ان باتوں کے متعلق بھی سچ بولنے لگتا ہے جن کی بابت اسے عالم صحو میں راست گوئی کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ پنجابی زبان میں بھی اسی طرح کا ایک محاورہ ہے "مَد پلاؤ اور ذات پہچانو" انسان کی اصلیت بہت کچھ اس کے تحت الشعور میں ہوتی ہے۔ شراب اس تحت الشعور میں سے بہت کچھ ابھار کر باہر لے آتی ہے۔ شراب کے ہلکے نشے میں بعض لوگوں نے جو نظم اور نثر لکھی ہے اس میں اعلیٰ درجے کے حکیمانہ افکار اور بلند پایہ اشعار ملتے